حافظ اور اقبال

ڈاکٹر علی رضا طاہر

حافظ ایک بلند پایہ عالم، عارف، حافظ قرآن، مفسر، عظیم شاعر اور نابغہ انسان گذرے ہیں۔ ان کے اشعار بہت اعلیٰ پائے کی عرفانی شاعری میں شمار کیے جاتے ہیں۔ حافظ کے حامی اور ناقد ہر دور میں رہے ہیں۔ حافظ کے مداح اس بات کے داعویدار ہیں کہ اُس نے تصوف میں بہت سے عملی مدارج طے کیے تھے۔ لوگ اُس کے دیوان سے فال نکالا کرتے تھے۔ مشرق و مغرب کے نامور شعراء حامی و ناقد، ہر دو نے حافظ کی شاعرانہ عظمت، نکتہ آفرینی، دقتِ نظر، تخلیقی تخیل، بے مثل و منفرد اسلوب سخن اور مؤثر لہجے کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے نامور شعراء اور اساتذہ کے کلام میں حافظ کے رنگِ تغزل کی جھلک اور ان کے تخیل، طرز سخن اور تراکیب و تشبیہات کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے۔

حافظ کی بلند خیالی اور معنی آفرینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ بعض نامور شخصیات نے حافظ کے صرف ایک شعر کی تشریح و تفسیر پر مکمل کتابیں تحریر کی ہیں۔ مثلاً نویں صدی ہجری کے نامور فلسفی، ماہر اخلاق اور عارف علامہ جلال الدین دوانی نے حافظ کے مندرجہ ذیل شعر پر ایک مکمل رسالہ تحریر کیا:

پیر ما گفت خطا بر قلم صنع نرفت
آفرین بر نظر پاک خطا پوشش باد[1]

استاد سعید نفیسی کے مطابق:

> In the eighth/ fourteenth century Hafiz, the great immortal poet of Iran, while following the naturalist school which had reached its highest point of glory in Rumi's poetry (606/1200-691/1292) laid the foundation of impressionism in poetry.[2]

میر سید شریف ایران کے نامور مدرس، متکلم، فلسفی اور عارف تھے۔ اُن کے مطابق حافظ کی شاعری الہام، احادیث قدسی، حکیمانہ لطائف اور نکاتِ قرآنی سے مملو ہے۔[3]

خواجہ حافظ اور علامہ اقبال کا شعری و فکری اشتراک اور اختلاف برصغیر پاک و ہند کی ادبی روایت کا ایک دلچسپ باب ہے۔ علامہ اقبال جہاں حافظ کے ناقد ہیں وہیں حافظ کی لے میں بات کرتے بھی نظر

آتے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے بقول: ''اقبال نے پیرایۂ بیان کی حد تک حافظ کا تتبع کیا اور شعوری طور پر رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی۔''[۴]

اقبال کی اردو شاعری میں چار مقامات پر حافظ کے حوالے سے اقبال کا یہ نقطۂ نظر ملتا ہے:

۱- حافظ کے اشعار کو اپنے موقف کی تائید میں بطور تضمین استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔[۵]

۲- بانگ درا کی نظم ''قربِ سلطان'' میں اپنے موقف کی حمایت میں ''مرشد شیراز'' کا پیغام ذکر کرتے ہیں۔[۶]

۳- بانگ درا کی نظم ''ایک خط کے جواب میں'' سلاطین کی محافل کو مردہ دلی کی علامتیں قرار دیتے ہوئے اپنے موقف کی تائید میں حافظ کا ایک شعر ذکر کرتے ہوئے حافظ کو ''حافظ رنگیں نوا'' قرار دیتے ہیں۔[۷]

۴- ضرب کلیم میں ''ایجادِ معانی'' کے عنوان کے تحت محنت پیہم کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ''میخانہ حافظ'' کی تعمیر کے لیے ''خونِ رگِ معمار'' کی گرمی کو لازمی قرار دیتے ہیں۔[۸]

۱۹۰۵ء تا ۱۹۰۷ء اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ میں رہے۔ اس دوران انھوں نے پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ *The Development of Metaphysics in Persia* تحریر کیا۔ اس تحقیقی مقالے کے باب پانچ میں علامہ اقبال ''حقیقت کو بطور جمال'' سمجھنے والے صوفیہ کے مکتب کی وضاحت کرتے ہوئے اُس دور میں نمو پانے والی تحریکوں کے تذکرے میں تیرھویں صدی عیسوی کی ایک تحریک ''واحد محمود کا تکثیری ردعمل'' کا تذکرہ کرتے ہیں اور اسی تحریک کے تسلسل میں حافظِ شیراز کا ذکر کرتے ہیں:

> Speaking from a purely philosophical standpoint, the last movement is most interesting. The history of thought illustrates the operation of certain general laws of progress which are true of the intellectual annals of different people. The German systems of monistic thought invoked the pluralism of Herbart; while the pantheism of Spinoza called forth the monadism of Leibniz. The operation of the same law led Wahid Mahmud to deny the truth of contemporary monism, and declare that reality is not one, but many, long before Leibniz he taught that the Universe is a combination of what he called "Afrad"—essential units, or simple atoms which have existed from all eternity, and are endowed with life. The law of the Universe is an ascending perfection of elemental matter, continually passing from lower to higher forms determined by the kind of food which the fundamental units assimilate. Each period of his cosmogony comprises 8,000 years, and after eight such periods the world is decomposed, and the units re-combine to construct a new universe. Wahid Mahmud succeeded in founding a sect which was cruelly persecuted, and finally stamped out of existence by Shah Abbas. It is said that the poet Hafiz of Shiraz believed in the tenets of this sect.[9]

اقبال تصوف پر ایک کتاب لکھنا چاہتے تھے لیکن بوجوہ ایسا نہ کر سکے البتہ انھوں نے ابتدائی نوعیت کے نکات اپنی ڈائری میں تحریر کیے۔ ان نکات کو معروف محقق اور اقبال شناس صابر کلوروی نے مرتب کر کے تاریخ تصوف کے نام سے شائع کیا ہے۔ تاریخ تصوف کے باب ۵ کے نکات میں اقبال نے حافظ کے

تقریباً آٹھ شعر نقل کیے ہیں۔ ان اشعار کے عنوانات ''فضیلت عجم و عرب''، ''حقیقت گناہ''، ''آئین حیات''، ''تقدیر''، ''اسلامی بہشت حور و قصور'' وغیرہ قائم کیے گئے ہیں۔ انھی اشعار میں حافظ کا وہ شعر بھی ہے جو ''تقدیر پرستی'' کے متعلق ہے اور جس کو بعدازاں دیگر باتوں کے ساتھ حافظ کی روش پر تنقید کے لیے اقبال نے بطور دلیل پیش کیا۔ وہ شعر درج ذیل ہے:

در کوئے نیک نامی ما را گذر نہ دادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را[۱۰]

(کوچۂ نیک نامی میں کوئی ہمیں جانے نہیں دیتا، اگر تجھے یہ پسند نہیں تو، تو ہماری تقدیر بدل دے۔)

باب ۵ ''تصوف اور شاعری'' کے نکات میں اقبال نے جو اشعار نقل کیے ہیں ان کے بیان سے پہلے اس کتاب کے مرتب پروفیسر صابر کلوروی نے یہ نوٹ دیا ہے: ''علامہ نے تصوف کے ضمن میں اپنے نظریات کی تائید میں صوفی شعراء کے چند اشعار بھی منتخب کیے تھے جو اس باب میں پیش کیے جا رہے ہیں۔''[۱۱]

تاریخ تصوف کی تحریر میں اقبال کے پیش نظر کیا موقف تھا اور اس کا دورانیہ کیا بنتا ہے، اس پر تاریخ تصوف کے پیش گفتار میں ڈاکٹر محمد ریاض کی رائے سے راہنمائی ملتی ہے۔[۱۲]

تاریخ تصوف میں حافظ کے حوالے سے علامہ اقبال کے نقطۂ نظر کو مختصر الفاظ میں ناقدانہ کہا جا سکتا ہے جس میں وہ عامۃ الناس میں پیدا ہونے والی غفلت، تن آسانی اور راہبانی انداز کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔

پیام مشرق کے دیباچے میں اقبال نے دیگر عجمی شعراء کے ساتھ حافظ کا ذکر بھی کیا ہے۔ دیباچے میں جتنے مقامات پر بھی حافظ کا ذکر ہوا ہے وہ سب توصیفی انداز میں ہے۔ جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے نامور جرمن شعراء گوئٹے، فان ہیمر، ڈومر، ہرمن سٹال، لوشکے، سٹاگ لٹز، لنٹ ہولڈ اور فان شاک وغیرہ پر حافظ کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔[۱۳]

پیام مشرق کے دیباچے میں اقبال نے گوئٹے کے سوانح نگار بیل سوشکی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

بلبل شیراز کی نغمہ پردازیوں میں گوئٹے کو اپنی ہی تصویر نظر آتی تھی۔ اُس کو کبھی کبھی یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ شاید میری روح ہی حافظ کے پیکر میں رہ کر مشرق کی سرزمین میں زندگی بسر کر چکی ہے۔ وہی زمینی مسرت وہی آسمانی محبت، وہی سادگی، وہی عمق، وہی جوش و حرارت، وہی وسعتِ مشرب، وہی کشادہ دلی اور وہی قیود و رسوم سے آزادی، غرضیکہ ہر بات میں ہم اُسے حافظ کا مثیل پاتے ہیں۔ جس طرح حافظ لسان الغیب و ترجمان اسرار ہے اسی طرح گوئٹے بھی ہے اور جس طرح حافظ کے بظاہر سادہ الفاظ میں ایک جہانِ معنی آباد ہے اسی طرح گوئٹے کے بے ساختہ پن میں بھی حقائق و اسرار جلوہ افروز ہیں۔ دونوں نے امیر و غریب سے خراجِ تحسین وصول کیا۔ دونوں نے اپنے اپنے وقت کے عظیم الشان فاتحوں کو اپنی شخصیات سے متاثر کیا

(یعنی حافظ نے تیمور کو اور گوئٹے نے نپولین کو) اور دونوں عام تباہی اور بربادی کے زمانے میں طبیعت کے اندرونی اطمینان وسکون کو محفوظ رکھ کر اپنی قدیم ترنم ریزی جاری رکھنے میں کامیاب رہے۔[۱۴]

خواجہ حافظ کے گوئٹے اور جرمنی کی مشرقی تحریک پر اثرات کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کہتے ہیں:

۱۸۱۲ء میں فان ہیمر نے خواجہ حافظ کے دیوان کا پورا ترجمہ شائع کیا اور اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا۔ گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اُس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن وسکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اس کے تخیلات میں ایک ہیجان عظیم برپا کر دیا جس نے آخر کار ''مغربی دیوان'' کی ایک پائیدار اور مستقل صورت اختیار کر لی مگر فان ہیمر کا ترجمہ گوئٹے کے لیے محض ایک محرک ہی نہ تھا بلکہ اس کے عجیب وغریب تخیلات کا ماخذ بھی تھا۔ بعض بعض جگہ اُس کی نظم خواجہ کے اشعار کا آزاد ترجمہ معلوم ہوتی ہے۔[۱۵]

پیام مشرق کی اشاعت ۱۹۲۳ء میں ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اقبال یورپ سے واپسی کے بعد اسرار خودی اور رموز بے خودی شائع کر چکے تھے اور حافظ کے حوالے سے اسرار خودی کے اشعار پر جو علمی ہنگامہ شروع ہوا تھا وہ بھی خاصا سرد پڑ چکا تھا۔ اس سے قبل اقبال کی اس مسئلے پر خواجہ حسن نظامی سے خط کتابت اور وکیل امرتسر میں مضامین کی اشاعت بھی ہو چکی تھی۔ اس تمام معاملے سے ہمیں اس بات کی طرف راہنمائی ملتی ہے کہ اقبال جہاں کہیں جوہر دیکھتے ہیں اس کی ستائش کرتے ہیں اور وہ جس ستائش اور توجہ کے قابل ہوتا ہے اتنا ہی سراہتے ہیں جیسا کہ گذشتہ سطور میں حافظ اور گوئٹے کے بیان میں ہم حافظ کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر کو پڑھ آئے ہیں۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے تو وہاں مس بیک (لندن) کے ہاں عطیہ بیگم کے ساتھ اقبال کی پہلی ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں دیگر موضوعات کے علاوہ جب حافظ کے متعلق باہمی گفت وشنید ہوئی تو اقبال نے حافظ کے متعلق اپنی رائے کا ان الفاظ میں اظہار کیا: ''جب میرا ذوق جوش پر آتا ہے تو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔''[۱۶]

اس زمانے میں عطیہ بیگم سے اقبال کی ملاقاتوں کے دوران، حافظ کے تذکرے اور ان کے خوبصورت اشعار کے برجستہ اور برمحل استعمال کے متعلق کئی شواہد ملتے ہیں۔[۱۷]

اقبال نے یورپ سے واپسی کے بعد مختلف اوقات میں مختلف حوالوں سے جو خطوط لکھے ان میں بھی خواجہ حافظ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ سراج الدین پال کے نام ۱۰/جولائی ۱۹۱۶ء کو اقبال کے محررہ

ایک خط میں حافظ کے متعلق ان کے نقطۂ نظر کا خلاصہ یوں ملتا ہے:

حافظ کی شاعری دور انحطاط کی شاعری ہے۔ دور انحطاط کی شاعری نے نہ صرف یہ کہ ملت کو تحرک و جہد مسلسل کی بجائے اضمحلال و سستی اور خود فراموشی کا درس دیا بلکہ شعائر اسلام کی وحدت الوجودی اساسات پر بظاہر دلفریب طریقوں سے تشریح کر کے اسلام کی ہر محمود شے کو مذموم بنا دیا جس کا لامحالہ نتیجہ یہ نکلا کہ ملت ذوق عمل سے محروم ہوگئی۔[۱۸]

سراج الدین پال کے نام اپنے دو خطوط محررہ ۱۶ اور ۱۹ر جولائی ۱۹۱۶ء میں انھیں حافظ کے متعلق مضمون لکھنے کے لیے اشارات دیتے ہوئے، حافظ کے متعلق لوگوں کی مختلف آراء، بعض کے نزدیک ''ولی کامل'' اور بعض کے نزدیک اُس کا کلام پڑھنے والوں پر جنون طاری ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔[۱۹]

اقبال نے اپنی فارسی مثنوی اسرار خودی میں جب خواجہ حافظ کی شاعری سے ملت پر مرتب ہونے والے منفی اثرات کا تذکرہ کیا اور اُن کی شاعری کے نصب العین پر تنقید کی تو جہاں ہندوستان بھر سے دیگر بہت سے افراد نے اقبال کو مورد الزام ٹھہرایا وہاں اقبال کے مداح، دوست اور ممدوح خواجہ حسن نظامی نے بھی اقبال پر شدید نکتہ چینی کی۔ خواجہ حسن نظامی کی اس روش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لسان العصر اکبر الٰہ آبادی کے نام اپنے ۴ر فروری ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں اقبال کہتے ہیں:

میں تصوف کی تاریخ پر ایک مبسوط مضمون لکھ رہا ہوں جو ممکن ہے ایک کتاب بن جائے چونکہ خواجہ (حسن نظامی) نے عام طور پر اخباروں میں میری نسبت یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیائے کرام سے بدظن ہوں اس واسطے مجھے اپنی پوزیشن صاف اور واضح کرنی ضروری ہے ورنہ اس طویل مضمون کے لکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ چونکہ میں نے خواجہ حافظ پر اعتراض کیا ہے اس واسطے ان کا خیال ہے میں تحریک تصوف کو دنیا سے مٹانا چاہتا ہوں۔[۲۰]

اکبر الٰہ آبادی کے نام ہی اپنے ۱۱ر جون ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں خواجہ حافظ کے متعلق اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے خواجہ حافظ پر کہیں یہ الزام نہیں لگایا کہ اُن کے دیوان سے مے کشی بڑھ گئی میرا اعتراض حافظ پر بالکل اور نوعیت کا ہے۔ اسرار خودی میں جو کچھ لکھا گیا وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر ہے۔ اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا، اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔ خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا نہ اُن کی شخصیت سے، نہ اُن اشعار میں ''مے'' سے مراد وہ ''مے'' ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بلکہ اس سے وہ حالت سکر (narcotic) مراد ہے جو حافظ کے کلام میں بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ حافظ ولی اور عارف تصور کیے گئے ہیں اس واسطے اُن کی شاعرانہ حیثیت عوام نے بالکل ہی نظر انداز کر دی ہے اور میرے ریمارک تصوف

اور ولایت پر حملہ کرنے کے مترادف سمجھے گئے۔[۲۱]

حافظ محمد اسلم جیراجپوری کے نام اپنے ۷ رمئی ۱۹۱۹ء کے ایک خط میں بھی خواجہ حافظ پر اسرار خودی میں کی گئی تنقید کے حوالے سے اپنی پوزیشن یوں واضح کرتے ہیں:

خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے اُن کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا اُس کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُس پر بڑی لے دے ہوئی۔ اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن، حُسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر، تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں۔ بہرحال میں نے وہ اشعار حذف کر دیے ہیں اور اُن کی جگہ اسی لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں۔[۲۲]

علامہ اقبال نے ''اسرار خودی اور تصوف'' کے عنوان کے تحت ایک مضمون لکھا جو ۱۵ رجون ۱۹۱۶ء کے وکیل امرتسر میں شائع ہوا۔ یہ مضمون خاصا طویل ہے۔ اس میں اقبال نے حافظ کے بارے میں اپنے تفصیلی نقطۂ نظر کو بیان کیا۔ اس مضمون کے اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱- خواجہ حافظ پر میری تنقید ہر دو اعتبار سے ہے: (۱) بحیثیت صوفی (۲) بحیثیت شاعر۔

۲- بحیثیت صوفی اُن کا نصب العین یہ ہے کہ وہ اپنے آپ میں اور دوسروں میں اپنے اشعار کے ذریعے وہ حالت پیدا کریں جس کو تصوف کی اصطلاح میں حالت سکر کہتے ہیں۔

۳- سکر کی حالت اسلامی تعلیم کا منشا نہیں ہے۔

۴- ایک مسلمان قلب کی مستقل کیفیت بیداری ہے نہ کہ خواب یا سکر۔

۵- کسی شاعر پر تنقید کے لیے اُس کے عام نصب العین کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

۶- شاعرانہ اعتبار سے حافظ اس قدر بلند ہیں کہ جو مقصد شعراء پوری غزل میں بھی حاصل نہیں کر سکتے خواجہ حافظ ایک لفظ میں حاصل کر لیتے ہیں۔

۷- خواجہ کی شاعری کا جو نصب العین ہے وہ زندگی کے منافی ہے۔ زندگی کی قوت کو کمزور اور پست کرنے کا میلان رکھتا ہے اور قومی اعتبار سے مضرت رساں ہے۔

۸- مجھے حافظ کی پرائیویٹ زندگی سے کوئی سروکار نہیں مجھے صرف اُس نصب العین پر تنقید کرنا مقصود ہے جو بحیثیت ایک صوفی شاعر ہونے کے اُن کے پیش نظر ہے۔[۲۳]

جب خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۱۶ء میں اقبال کی مثنوی اسرار خودی (پہلا اڈیشن جس میں علامہ اقبال نے حافظ کے نام کے ساتھ اشعار لکھے اور اُس پر تنقید کی) پر اپنے اعتراضات ''سر اسرار خودی'' نامی مضمون کی صورت میں ۳۰ رجنوری ۱۹۱۶ء کے خطیب میں شائع کیے تو اقبال نے بھی اسی عنوان (سرِ اسرار خودی) سے

ایک مضمون لکھ کر خواجہ حسن نظامی کے اعتراضات کے جواب دیے۔ اقبال نے لکھا: ''حافظ کے متعلق میرا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری نے مسلمانوں کے انحطاط میں بطور ایک عنصر کے کام کیا ہے۔''[۲۴]

مثنوی اسرار خودی کے دوسرے اڈیشن کے دیباچے میں اقبال لکھتے ہیں:

اس مثنوی کی پہلی ایڈیشن ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس دوسری ایڈیشن میں جو اَب ناظرین کی خدمت میں پیش کی جاتی ہے بعض جگہ لفظی ترمیم ہے بعض جگہ اشعار کی ترکیب میں فرق ہے اور ایک آدھ جگہ تشریح مطالب کے لیے اشعار کا اضافہ ہے لیکن سب سے بڑی ترمیم یہ ہے کہ اس ایڈیشن سے وہ اشعار خارج کر دیے گئے ہیں جو خواجہ حافظ پر لکھے گئے تھے۔ اگرچہ اُن سے محض ایک ادبی نصب العین کی تنقید مقصود تھی اور خواجہ حافظ کی شخصیت سے کوئی سروکار نہ تھا تاہم اس خیال سے کہ یہ طرز زبان اکثر احباب کو ناگوار ہے میں نے اُن اشعار کو نکال کر اُن کی جگہ نئے اشعار لکھ دیے ہیں جن میں اس اصول پر بحث کی ہے جس کی رو سے میرے نزدیک کسی قوم کے لٹریچر کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنا چاہیے۔ پہلے ایڈیشن کے اردو دیباچے کی اشاعت بھی ضروری نہیں سمجھی گئی۔[۲۵]

حافظ اور مولانا روم سے اقبال کے قرب و اشتراک اور اکتساب کو ڈاکٹر یوسف حسین خاں یوں بیان کرتے ہیں:

حافظ کے تغزل میں حسنِ ادا اور ہیئت اپنی معراج کو پہنچ گئی جس کی مثال فارسی اور اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی۔ بلاشبہ مولانا روم کو طرز ادا اور ہیئت میں وہ بلند مقام نہیں ملا جو حافظ کو حاصل ہے۔ مولانا روم کے معانی اور موضوع نہایت بلند اور اخلاقی افادیت کے حامل ہیں لیکن، اُن کی مثنوی اور غزلیات جو شمس تبریز کے دیوان میں شامل ہیں، ڈھیلی ڈھالی اور ناہموار زبان میں پیش کی گئی ہیں۔ اُن کے کلام کی ہیئت حافظ کے مقابلے میں جاذب نظر نہیں کہی جا سکتی۔ اس کے برعکس اقبال کا پیرایۂ بیان مولانا روم کے مقابلے میں حُسنِ ادا کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ اقبال نے پیرایۂ بیان کی حد تک حافظ کا تتبع کیا اور شعوری طور پر رنگینی پیدا کرنے کی کوشش کی۔[۲۶]

حافظ اور اقبال کے قرب و بُعد کی اس داستان کو مزید یوں آگے بڑھایا جا سکتا ہے کہ ''حافظ اور اقبال دونوں کے یہاں عشق فنی محرک ہے۔ حافظ کا عشق مجاز و حقیقت کا ہے اور اقبال کا مقصدیت کا۔''[۲۷] دونوں اپنے اپنے عہد کے انتشار و زوال پر دل گرفتہ تھے مگر ''اقبال کی تنقید کا نشانہ مغربی سامراج تھا اور حافظ کی تنقید کا رُخ اُن کی طرف تھا جو دین و تمدن کی پیشوائی کے دعوے دار تھے اور اپنے اخلاقی عیوب کو ریاکاری کے لبادے میں چھپاتے تھے۔''[۲۸] ''دونوں کا جمالیاتی تجربہ جذبہ و وجدان سے اپنی غذا حاصل کرتا ہے۔''[۲۹] دونوں کے یہاں اور خاص کر حافظ کے یہاں ہیئت، موضوع اور جذبہ شیر و شکر ہیں''۔[۳۰]

ڈاکٹر یوسف حسین خاں اپنی کتاب حافظ اور اقبال کے دیباچے میں کہتے ہیں:

بہت سے امور میں حافظ اور اقبال میں مماثلت ہے اگرچہ شروع میں اقبال نے حافظ پر تنقید کی تھی لیکن بعد میں اُس نے محسوس کیا کہ اپنی مقصدیت کو مؤثر بنانے کے لیے حافظ کا پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اُس نے حافظ کے طرز و اسلوب کا شعوری طور پر تتبع کیا اور بعض اوقات جیسا کہ اُس نے کہا ہے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ حافظ کی روح اُس میں حلول کر آئی ہو یہی وجہ ہے کہ طرز و اسلوب میں وہ حافظ سے بہت قریب ہے۔[۳۱]

اس حوالے سے مذکورہ بالا کتاب کے ابواب چہارم اور پنجم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ باب ۴ ''حافظ اور اقبال میں مماثلت اور اختلاف'' کے زیرِ عنوان ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے تقریباً ۴۰ کے قریب موضوعات اور تراکیب کا ذکر کیا ہے جن کے استعمال و انتخاب میں دونوں میں اشتراک ہے اور پھر خلاقی طبع کے باعث جہاں ان دونوں میں اختلافِ نظر ہے اُس کو بھی بیان کیا ہے۔ اسی طرح باب ۵ ''محاسن کلام'' میں مصنف نے کلام اور ادب کی ان اصناف و صنائع کو بیان کیا ہے جن کے استعمال میں دونوں مشترک ہیں۔

پروفیسر مرزا محمد منور کی کتاب علامہ اقبال کی فارسی غزل کے ''مقدمہ'' میں ڈاکٹر محمد صدیق شبلی رقمطراز ہیں:

اس کتاب میں حافظ و اقبال کی تقریباً دو درجن ہم زمین و ہم طرح غزلیں دی گئی ہیں۔ پیام مشرق کی وہ غزلیں اس کے علاوہ ہیں جو حافظ کے رنگ و اسلوب میں ہیں بلکہ ''مئے باقی'' کا عنوان بھی حافظ ہی سے ماخوذ ہے۔ ضرب کلیم ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اس میں ''ایجاد معانی'' کے زیرِ عنوان ایک نظم میں حافظ کے فنی کمال کا ذکر تعریفی انداز میں آیا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود علامہ اقبال اور خواجہ حافظ کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس سے قارئین اقبال کو تھوڑی سی الجھن ضرور ہوتی ہے کہ علامہ اقبال خود کلام حافظ سے اس قدر متاثر ہیں لیکن دوسروں کو اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ دراصل بات یہ ہے کہ حافظ فارسی غزل کا نقطۂ کمال ہیں اور علامہ اقبال حافظ کے اس مرتبے کو تسلیم کرتے ہیں۔ انھوں نے حافظ کے طرز و اسلوب کی تعریف بھی کی ہے اور تقلید بھی لیکن جہاں تک حافظ کے افکار کا تعلق ہے ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر علامہ اقبال نے کہیں اُن کے بارے میں مثبت رائے کا اظہار نہیں کیا۔ حافظ کی غزل کو علامہ اقبال حسن بیان کا معجزہ ضرور جانتے ہیں لیکن اقبال صرف شاعر نہیں حکیم الامت بھی تھے۔ شاعر اقبال تو حافظ کے زیر اثر رہے مگر حکیم الامت، اُمت کے وسیع تر مفاد میں حافظ کے ساتھ نہیں چل سکے۔[۳۲]

علامہ اقبال کا حافظ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ حافظ کے اشعار تحریک کے منافی ہیں، افراد و اقوام کو قوتِ عمل سے محروم کرتے ہیں، جدوجہد کے عزم کو کمزور کرنے کا رجحان پیدا کرتے ہیں جس سے اسلامی تہذیب کی بنیادیں متزلزل ہونے کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ اس حوالے سے پروفیسر مرزا محمد منور نہایت خوب صورتی کے ساتھ حافظ کا دفاع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

علامہ اقبال نے حضرت حافظ کو اسرار خودی کی اشاعت سے قبل اور بعد بھی زوروں کی داد دی۔ اختلاف کی بنا مختلف تھی اور وہ خواجہ حافظ کے اشعار کا سطحی المزاج اور زوال پذیر افراد معاشرہ کے قلوب و اذہان پر منفی اثر تھا۔ عوام عموماً ظاہر پرست واقع ہوئے ہیں۔ وہ رمز و ایما کی گہرائیوں میں اترنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔ لہٰذا اکثر اوقات وہ شاعر کے اصل مقصود سے دور جا پڑتے ہیں۔ علامہ اقبال نے قوم میں مقاومت کی روح پیدا کرنی چاہی اور جلترنگ کے بدلے لہو ترنگ اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ وہ زجاج کو حریفِ سنگ بنانا چاہتے تھے۔ ایسے عالم میں خانقاہوں اور زاویوں میں اور منبروں پر خواجہ کے ایسے خاص اشعار کی تلحین اور قوالی جو حالات سے نبرد آزما ہونے کی تعلیم دینے کے بجائے حالات سے ساز باز کرنے اور قانع ہو رہنے کی ترغیب دے، علامہ اقبال کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔[۳۳]

اس ساری صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہوئے مندرجہ ذیل باتیں پیش نظر رکھنی چاہییں:

۱- حافظ کے دیوان سے اشعار کا انتخاب کرنے والے لوگ کون تھے؟ ان کی سطحِ فکر کیا تھی؟ نیز ان کے مقاصد کیا تھے؟

۲- دیوانِ حافظ میں زندگی آموز اور انقلاب آفریں غزلیں موجود ہیں جو سامنے نہیں لائی گئیں۔

۳- حافظ کے اشعار کا سیاق و سباق، ماحول، پس منظر و پیش منظر نیز سن تحریر موجود نہ ہونا جس سے منشائے شاعر تک راہنمائی ہو سکے۔

۴- حافظ کے مفصل حالات، سوانح حیات، ملفوظات اور مکتوبات وغیرہ کا مہیا نہ ہونا، جن کی روشنی میں اُس کے کلام نیز استعارات و تشبیہات، نکات و اصطلاحات اور رموز و علائم کی حقیقی روح کو سمجھا جا سکے۔

مرزا صاحب کے نزدیک یہ وہ بنیادی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے حافظ کے کلام، اُس کی شخصیت اور اُس کے ادبی مقاصد کے حوالے سے اشتباہات پیدا ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ مرزا محمد منور نے کلام اقبال اور کلام حافظ کی کئی حوالوں سے صوری، صوتی، ترکیبی، ہیئتی اور فنی مشابہتوں کا نہایت عمدگی سے ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ خلیفہ عبدالحکیم کی رائے ذکر کرنے کے بعد اُس کا نہایت متوازن تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

اس اعتبار سے خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی یہ رائے حقیقت سے کوئی زیادہ بعید نہیں معلوم ہوتی کہ اقبال کی کئی فارسی غزلیں ایسی ہیں کہ اگر اُن کو دیوان حافظ میں داخل کر دیا جائے تو پڑھنے والے حافظ کے کلام سے اُن کا امتیاز نہ کر سکیں۔[۳۴]

خلیفہ عبدالحکیم کی اس رائے میں مرزا صاحب یوں ترمیم و اضافہ کرتے ہیں:

میں خلیفہ صاحب کے بیان میں اتنی تبدیلی ضرور چاہوں گا کہ کئی فارسی غزلیں ایسی ہیں جن کے بیشتر اشعار کو دیوانِ حافظ میں شامل کیا جا سکتا ہے پوری کی پوری غزلیں دیوان حافظ میں نہیں سما سکتیں اس لیے کہ شاید ہی

کوئی غزل ایسی ہو جو ایک آدھ خالص ''اقبالی'' مضامین کی مالک نہ ہو۔[۳۵]

ڈاکٹر انماری شمل The Genius of Shiraz: Sadi and Hafiz میں کلام حافظ کے حوالے سے پیدا ہونے والے اشتباہات کے ضمن میں یوں اظہار نظر کرتی ہیں:

> Hafiz is not a romantic poet, it is the clear-cut, polished quality of his verse that is so fascinating, and at the same time so difficult to assess for a Western reader who is used, at least from the eighteenth century, to *Erlebnis-Kyrik* that is, the poetry that translates a real experience of the writer into verse ----- and who no longer understands the "learned", and intellectual character of most of Persian poetry in which many sentiments are filtered, as it were, through the mind until one perfect line contains their quintessence.[36]

حافظ کے کلام کے معانی اور تفسیر و تشریح کے حوالے سے پیدا ہونے والے اشتباہات اور غلط فہمیوں کا مستند دلائل کے ساتھ نہایت عمدہ محاکمہ محمد سہیل عمر نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ اُنھوں نے یہ سوال بھی اُٹھایا ہے کہ حافظ کی تفہیم کے سلسلے میں اقبال کے اپنے ذرائع کیا تھے۔ اس سلسلے میں محمد سہیل عمر نے مندرجہ ذیل اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے:

۱- اقبال نے کلام حافظ کی بلاواسطہ تفہیم کی۔

۲- اقبال نے دیوان حافظ کے مختلف تراجم کے ذریعے اُس کے کلام کی تفہیم کی۔

۳- کلام حافظ کے مترجمین میں ایک ایسا گروہ بھی ہے جنھوں نے کلام حافظ کی تشریح انتہائی سطحی اور عامیانہ انداز سے کی اور اُس کے اشعار میں استعمال ہونے والے رموز و ایما کو انتہائی سطحی انداز سے لیا۔

۴- ترک روایت میں "Sudi" ایسے ہی شارحین حافظ میں سے ہے۔ (علامہ اقبال کے خطوط میں "Sudi" کے ترجمۂ دیوان حافظ اور پھر اُس کے ترجمہ کے جرمن زبان میں منتقل ہونے کا ذکر موجود ہے)

۵- Joseph Von Hammer-Purgstalls کا دیوانِ حافظ کو جرمن زبان میں ترجمہ کرنا اور انیسویں صدی کے اوسط درجے کے جرمن شعراء کا حافظ کے اشعار و تراکیب اور نام کو اپنی سطحی فکر اور تفہیم کے لیے استعمال کرنا۔[۳۷]

ان مباحث کو سمیٹتے ہوئے محمد سہیل عمر لکھتے ہیں:

> In view of the foregoing facts, are we justified to feel ourselves inclined to find here traces of an unconcious influence of J.Von Hammer--Purgstall at work, carried over from his stay in Germany? It is hard to believe but there remains the possibility of these background influences that might have surfaced during his quest for identifying the causes of our decline in a concrete manner.[38]

ان نکات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حافظ کے حوالے سے علامہ اقبال کی آراء کا جائزہ لیتے وقت جہاں ہمیں اُن کے کلام حافظ کے بلاواسطہ مطالعے کے پہلو کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے وہیں اُن کے

بالواسطہ مطالعے و تفہیم (Sudi کا ترجمہ و شرح اور جرمنی میں ترجمے کی روایت) کے پہلو کو بھی ضرور زیرِ بحث لانا چاہیے۔

بہر حال حافظ کی شاعری کو جیسے بھی سمجھا جائے، اُس کے مترجمین اُس کو جس بھی رنگ میں آگے منتقل کریں، یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مشرق و مغرب کی اعلیٰ شاعری اور نامور شعراء پر خواجہ حافظ کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری/چودھویں صدی عیسوی کے بعد کی ایرانی فارسی شاعری ہو یا برصغیر پاک و ہند کی فارسی اور اردو شاعری، اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں جرمن شعر و فکر کا مجدد گوئٹے ہو یا بیسویں صدی عیسوی میں برصغیر کے شعر و فلسفہ و الٰہیات کا مغز متفکر اقبال، کسی نہ کسی رنگ میں چمنستانِ حافظ کے گل چیں نظر آتے ہیں۔

❁❁❁

حواشی و حوالہ جات

۱- مرتضیٰ مطہری، خدماتِ متقابل اسلام و ایران، انتشارات صدرا، تہران، ۱۳۴۲، ص ۴۴۰۔

2- M.M.Sharif (ed), *A History of Muslim phylosophy*, Vol-II, Royal Book Company, Karachi, 1983, p.105.

۳- مرتضیٰ مطہری، خدماتِ متقابل اسلام و ایران، ص ۵۷۵۔

۴- اقبالیات کے سو سال (منتخب مضامین)، مرتبین: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر، ڈاکٹر وحید عشرت، اکادمی ادبیات، اسلام آباد، ۲۰۰۲، ص ۸۹۱۔

۵- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۲۸۸۔

۶- ایضاً، ص ۲۱۰۔

۷- ایضاً، ص ۲۳۹۔

۸- ایضاً، ص ۵۹۵۔

9- Allama Muhammad Iqbal, *The Development of Metaphysics in Persia*, Bazam-e-Iqbal, Lahore,1964, p.92.

۱۰- علامہ محمد اقبال، تاریخ تصوف، مرتبہ: صابر کلوروی، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۵-۱۰۸۔

۱۱- ایضاً، ص ۱۰۵۔

۱۲- ایضاً، ص ۱۲۔
۱۳- علامہ محمد اقبال، کلیات اقبال (فارسی)، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۱۷۸-۱۸۱۔
۱۴- ایضاً، ص ۱۷۹۔
۱۵- ایضاً، ص ۱۷۸-۱۷۹۔
۱۶- علامہ محمد اقبال، اقبال نامہ، مرتبہ: شیخ عطاء اللہ، حصہ دوم، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۱۰۶۔
۱۷- ایضاً، ص ۱۰۸۔
۱۸- ایضاً، ص ۳۴۔
۱۹- ایضاً، ص ۳۸، ۴۸۔
۲۰- ایضاً، ص ۵۱-۵۲۔
۲۱- ایضاً، ص ۵۴۔
۲۲- ایضاً، ص ۵۲-۵۳۔
۲۳- علامہ محمد اقبال، مقالات اقبال، مرتبہ: سید عبدالواحد معینی، شیخ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۱۶۴-۱۶۸۔
۲۴- ایضاً، ص ۱۷۳۔
۲۵- ایضاً، ص ۱۹۳۔
۲۶- اقبالیات کے سو سال، ص ۸۹۱۔
۲۷- ایضاً، ص ۸۸۵۔
۲۸- ایضاً، ص ۸۸۷۔
۲۹- ایضاً، ص ۸۸۸۔
۳۰- ایضاً۔
۳۱- یوسف حسین خاں، حافظ اور اقبال، غالب اکیڈمی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۷۔
۳۲- پروفیسر محمد منور مرزا، علامہ اقبال کی فارسی غزل گوئی (دیباچہ از ڈاکٹر صدیق شبلی) ایوان اردو، نارتھ ناظم آباد کراچی، ۱۹۷۷ء، ص ۱۳-۱۴۔
۳۳- ایضاً، ص ۶۲۔
۳۴- ایضاً، ص ۵۹۔
۳۵- ایضاً، ص ۵۸۔

36- A. Schimmel, The Genius of Shiraz..... In *Persian Literature*, Ed. Ehsan Yarshater, State University of N.Y. Press, Albany; 1998, p. 224.
37- Muhammad Suheyl Umar,"Contours of Ambivalence: Ibn Arabi and Iqbal---Historical Perspective" part III, *Iqbal Review*, Iqbal Academy Pakistan, Lahore, 1994, p. 47-51.
38- Ibid, p. 49.